ڈاکٹر بہاء الدین

برطانوی ہند میں تنسیخ جہاد کی بحث

دار العلوم دیوبند کے ترجمان رسالہ 'دار العلوم' کے جنوری تا مارچ ۲۰۰۰ء کے شمارے میں جناب مفتی نظر کلیم قاسمی ریسرچ اسکالر مرکز المعارف بمبئی کا قادیانیت کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے وہی دھن اپنائی ہے جو ایک عرصہ سے ہمارے دیوبندی بزرگوں نے مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کے بارے میں چھیڑ رکھی ہے کہ آپ نے تنسیخ جہاد کا فتوی دیا تھا۔ مفتی صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ 'برطانوی حکومت نے ایک طرف ان علماء کو خریدا جنہوں نے نہ صرف جہاد اور احکام جہاد کے نسخ ہونے کا فتوی دیا بلکہ اپنی تقریر و تحریر اور مختلف انداز میں احکام شریعت کے تعطل کا نعرہ لگایا۔ چنانچہ مولانا محمد حسین بٹالوی نے ایک رسالہ الاقتصاد فی مسائل الجہاد لکھ کر جہاد کو منسوخ کر دیا۔ (رسالہ مذکور۔ ص ۱۲۳)

اس تحریر کو پڑھ کر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ ہم اپنے قارئین کے سامنے دیوبندی حضرات کے اس پیہم پروپیگنڈے کی حقیقت بیان کریں جو مولانا بٹالوی کے بارے میں کیا جارہا ہے اور بتائیں کہ تنسیخ جہاد، تعطیل جہاد اور انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی مخالفت کی تاریخ کیا ہے۔

قارئین۔ انیسویں صدی کے برصغیر میں کفار کے خلاف جہاد کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ نہ مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب سے شروع ہوا تھا اور نہ ان پر ختم۔ ان کے نظریات نہ تو اس غزل کا مطلع تھے اور نہ مقطع۔ اس گیت کا آغاز دراصل ایک حنفی بزرگ مولوی میر محبوب علی دہلوی صاحب سے ہوا تھا جو انیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں حضرت سید احمد شہید کے (صوبہ سرحد میں) لشکر سے بھاگ کر

جہاد اور تحریک مجاہدین کی مخالفت میں کمر بستہ ہو گئے تھے۔ مولانا محمد میاں دیوبندی ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

مولانا محبوب علی صاحب دہلوی جب سید احمد صاحب سے چند جزوی باتوں پر خفا ہو کر (سرحد سے) دہلی پہنچے اور یہاں خفگی کا اظہار شروع کیا تو بقول مصنف 'سوانح احمدی' مولوی محبوب علی صاحب کے اغواء سے جو صدمہ کاروبار جہاد کو پہنچا آج تک اس لشکر (مجاہدین) کو کسی سکھ یا درانی کے ہاتھ سے نہیں پہنچا تھا۔ مولوی محبوب علی صاحب کے فتنہ کے بعد مدت تک ہندوستان سے (مجاہدین) کے قافلوں کا آنا بند ہو گیا، (علماء ہند کا شاندار ماضی۔ جلد دوم۔ مکتبہ محمودیہ لاہور۔ ۱۹۷۷ء ص ۲۴۹۔۵۰)

یہ مولوی محبوب علی صاحب اپنے جہاد مخالف نظریات میں اتنے پختہ ہو گئے تھے کہ جب اس واقعہ کے تقریباً تیس سال بعد ہند میں جنگ آزادی لڑی گئی تو اس وقت بھی آپ لوگوں کو فرنگیوں سے لڑنے سے منع کرتے تھے۔ جیسا کہ 'ارواح ثلاثہ' میں لکھا ہے۔ 'خان صاحب نے فرمایا کہ غدر میں بہت علماء مخالف تھے اور کہتے تھے کہ یہ جہاد نہیں ہے۔ انہی میں میر محبوب علی صاحب بھی تھے اور آپ وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے لوگوں کو غدر سے روکتے تھے۔ (ارواح ثلاثہ۔ مولانا اشرف علی تھانوی۔ اسلامی اکاڈمی لاہور۔ ۱۹۷۶ء، ص ۴۴۵۔۴۴۶)

اسی دور کے ایک اور حنفی بزرگ خواجہ سلیمان تونسوی کا ذکر مولانا غلام رسول مہر نے کیا ہے کہ انہوں نے مجاہدین کے ایک قافلہ سے جو بغرض جہاد اندرون ہند سے سرحد جا رہا تھا کسی بھی قسم کا تعاون کرنے سے معذرت کر لی تھی۔ اس قافلے کے قائد سید جعفر علی نقوی تھے۔ بروایت مولانا مہر جب یہ قافلہ تونسہ پہنچا تو وہاں وقت کے عظیم شیخ خواجہ سلیمان تونسوی سے ملاقات کی۔ خواجہ صاحب فرش پر بیٹھے تھے چاروں طرف لوگوں نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔ میں (سید جعفر علی) نے عرض کیا کہ کسی واقف کار رہبر کے ذریعے آگے پہنچا دیجئے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ ارادہ ٹھیک نہیں۔ راستہ خطرناک ہے۔ سکھوں کی فوج کے آدمی چھاپے مار رہے ہیں

اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں پڑنا منع ہے۔ ساتھ ہی فرمایا: لاتلقوا بایدیکم الی التھلکۃ۔ میں (جعفر علی) نے عرض کیا کہ اس آیت کا مضمون میں خوب سمجھتا ہوں۔ یہ راہ خدا میں خرچ کرنے کے بارے میں آئی ہے۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے اجیر کی درخواست کی تو خواجہ صاحب نے فرمایا۔ اجیر نایاب ہے۔ لوگ پریشان ہیں۔ دشمنوں سے بچ نہیں سکتے۔ نہ آگے جانے کی صورت ہے نہ پیچھے بچنے کی۔ اور نہ ٹھہرنے میں محفوظ رہنے کی کوئی امید ہے۔ اور فرمایا کہ بہتر ہے بہاول خاں رئیس بہاولپور کی نوکری کر لو۔ راستہ صاف ہو جائے گا تو آگے چلے جانا ---- (مولانا مہر کہتے ہیں کہ) سید جعفر علی نے صاف صاف عرض کر دیا کہ ہم لوگ نوکری کے لئے نہیں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آئے ہیں۔ ہمیں راستہ بتا دیجئے اور رہبر دے دیجئے۔ ہم رات کے وقت نکل جائیں گے۔ فرمایا اس کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ (جماعت مجاہدین۔ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۲۰۰)

قارئین۔ حضرت سید احمد کی شہادت کے بعد احناف کا ایک گروہ تو تحریک جہاد سے اعلانیہ لاتعلق ہو کر اس کی مخالفت پر اتر آیا تھا۔ جیسا کہ وہی سید جعفر علی نقوی جو پیر صاحب تونسہ شریف سے حضرت سید احمد کی زندگی میں مل چکے تھے۔ اب سید صاحب کی شہادت کے بعد واپس ہند آتے ہوئے لدھیانہ میں پیش آنے والے ایک واقعہ کا یوں ذکر فرماتے ہیں۔ "لدھیانہ پہنچ کر شاہ شجاع کی مسجد میں قیام کیا ---- امام مسجد مجاہدین کی تکفیر کرتا تھا ---- میری صورت دیکھ کر امام نے برا بھلا کہنا شروع کیا۔" (جماعت مجاہدین۔ ص ۲۰۶)

یہ مولوی صاحب کسی گاؤں کی مسجد کے عام قسم کے امام نہیں تھے۔ آپ افغانستان کے جلاوطن بادشاہ شاہ شجاع کی مسجد کے شاہی امام تھے۔ شاہی امام احناف کا بڑا آدمی ہی ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگوں نے مجاہدین اور تحریک جہاد کی مخالفت کے ساتھ ساتھ ہر ایسے کام سے اجتناب شروع کر دیا جس سے کسی بھی سطح پر تحریک سے وابستگی کا شبہ ہو سکتا ہو۔ جیسا کہ مولانا محمد میاں دیوبندی لکھتے ہیں کہ امیر المجاہدین مولانا ولایت علی صادق پوری نے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی سے

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن اور مولانا شاہ اسماعیل صاحب کے تصنیف فرمودہ رسالے طلب فرمائے۔ پہلے مطبع حسینی لکھنؤ سے ان کو طبع کرانے کی کوشش کی۔ مگر جب اس مطبع کے مالکوں نے ان کو طبع کرنے سے انکار کردیا تو دورہ بنگال کے دوران آپ (مولانا ولایت علی) نے یہ خدمت اپنے مرید خاص مولانا بدیع الزماں صاحب بردوانی کے سپرد کی۔ مولانا موصوف نے دس ہزار روپے کا ٹائپ پریس خرید کر ان کتابوں کو بار بار طبع کرایا۔ یہ عجیب معمہ ہے کہ مطبع حسینی لکھنؤ نے ترجمہ قرآن شریف کی طباعت سے انکار کردیا۔ (علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ ج ۳۔ ص ۵۔ ۲۴)

یاد رہے کہ قرآن کریم کا اردو ترجمہ جو حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی نے حضرۃ الامام سید احمد شہید کی تحریک پر کیا تھا۔ (دیکھئے خطبات آزاد۔ مرتبہ مالک رام۔ مطبوعہ لاہور ص ۲۶۱) کہ عوام قرآنی مطالب تک رسائی حاصل کرسکیں ابھی تک غیر مطبوعہ حالت میں پڑا ہوا تھا اور عام لوگوں کی اس ترجمے تک رسائی نہ تھی۔ اسی طرح شاہ اسماعیل کے رسائل جو تحریک مجاہدین کے پیغام کی حیثیت رکھتے تھے طبع کرکے عوام تک پہنچانا دراصل تحریک کے لئے کام کرنے کے مترادف تھا۔ مولانا ولایت علی نے یہ کام مطبع حسینی کے مالکوں سے اجرت پر کروانے چاہے۔ لیکن مالکوں نے شاید یہ سوچ کر کہ کہیں تحریک جہاد کی حمایت کا لیبل نہ لگ جائے اور انگریز ناراض نہ ہو جائیں یہ کام کرنے سے انکار کردیا۔

آگے بڑھیں تو ہمیں دیوبندی احناف کے استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی اور ان کے شاگردان رشید نظر آتے ہیں جنہوں نے مولوی محبوب علی صاحب کی زمین میں داد سخن دی اور ان کی شروع کی ہوئی غزل کا دامن اپنے اشعار کے آبدار موتیوں سے بھر دیا۔ مولانا مملوک علی (ف ۱۸۵۱ء) دہلی کالج میں پڑھاتے تھے۔ ان کے متعلق ایک دیوبندی محقق جناب پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب نے لکھا ہے کہ دہلی کالج کے تمام انگریز پرنسپلوں کے وہ معتمد رہے۔ کالج کی رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ انگریز پرنسپل مولانا مملوک علی پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اور ہر سالانہ رپورٹ

میں ان کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ ایک موقع پر گورنر جنرل بہادر نے مولانا مملوک علی کو انعام سے نوازا۔ صورت یہ ہوئی کہ ۱۵ اور ۱۷ نومبر ۱۸۴۵ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار منعقد کیا۔ ۱۷ نومبر کے دربار میں ۲۷ حضرات کو انعام و اکرام سے نوازا۔ مولانا مملوک علی مدرس اوّل کو خلعت سہ پارچہ مرحمت ہوا اس وقت انگریزی حکومت کا مقصد یہ تھا کہ مغربی علوم اور تعلیم ہندوستان کے مسلمانوں میں اور خاص طور سے دہلی کے مسلمانوں میں مروج و مقبول ہو۔ اس مقصد میں گورنمنٹ کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی...... مولانا مملوک علی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے بھی دہلی کالج کی تعلیمی سرگرمیاں یقینی آگے بڑھیں۔ اور مسلمانوں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی کہ جس نے نئے نظام تعلیم میں منسلک ہو کر خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج) مولانا محمد منیر (مدرس بریلی کالج) مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس) مولانا فضل الرحمان دیوبندی (ڈپٹی انسپکٹر مدارس) تو خاص ان کے اعزہ واحباب تھے۔ ان کے علاوہ شمس العلماء ڈپٹی شیخ ضیاء الدین ایل ایل ڈی۔ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ۔ شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء) شمس العلماء محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء) پیرزادہ محمد حسین (سیشن جج) خواجہ محمد شفیع (جج) خان بہادر میر ناصر علی (۱۹۳۳ء) مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء) مولوی جعفر علی (ف ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے حضرات ہیں جو اس کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں۔ اور کم و بیش ان تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسلک ہو کر نمایاں خدمات انجام دیں۔ اور گورنمنٹ نے بھی ان کی خدمات کو سراہا اور حسن صلہ سے نوازا۔ مولانا عبید اللہ سندھی کا یہ خیال ہے کہ جب ۱۲۵۷ھ میں شاہ محمد اسحاق حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے تو تحریک (جہاد) کی نگرانی کے لئے ایک بورڈ بنایا گیا جس کے صدر مولانا مملوک علی تھے...... اس میں شک نہیں کہ مولانا مملوک علی خانوادہ ولی اللہ کے فیض یافتہ شاہ محمد اسحاق کے معتمد و معتقد تھے۔ مگر ان کی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل تو درکنار کہیں اشارہ بھی نہیں ملتا۔ ان کی زندگی

تو تمام تر درس و تدریس سے عبارت رہی ہے۔ لہٰذا یہ صدارت کچھ محل نظر سی معلوم ہوتی ہے،(کتاب 'مولانا محمد احسن نانوتوی' از پروفیسر ایوب قادری۔ کراچی۔ ۱۹۶۶ء ص ۱۷۹۔۱۷۶)(یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جس بورڈ کے سربراہ کا یہ حال ہو کہ تاریخ میں اس کی جہادی یا سیاسی سرگرمیوں کا اشارہ تک نہیں ملتا وہ بورڈ اگر فی الواقع بنایا گیا تھا یا اس کا کہیں وجود تھا تو اس کے عام ارکان کی سرگرمیوں کو ڈھونڈ نکالنا کس قدر دشوار ہوگا۔)

مولانا مملوک علی کے ایک شاگرد شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین ایل ایل ڈی کے بارے میں جناب ایوب قادری صاحب لکھتے ہیں کہ ان کے والد 'داروغہ شیخ محمد بخش' موضع بستی تحصیل دہلی کے قدیم باشندے تھے۔ یہ خاندان گورنمنٹ (انگلشیہ) کا خیر خواہ تھا۔ غدر میں (داروغہ شیخ محمد بخش) دھیرج کی پہاڑی پر خبر رسانی کرتے تھے۔ جب انگریزی فوج دہلی میں داخل ہوئی تو داروغہ جی اپنے گھر ہی میں تھے۔ ایک سپاہی کی گولی سے ڈھیر ہو گئے۔ خبر رسانی کے صلہ میں کچھ اراضی انعام میں ملی۔ ان کے فرزند مولوی ضیاء الدین نے مولانا مملوک علی اور مفتی صدر الدین آزردہ سے علوم متداولہ کی تحصیل کی۔ دہلی کالج میں طالب علم رہے۔ پھر نارمل اسکول اور دہلی کالج کے مدرس رہے۔ جب ۱۸۵۷ء میں دہلی کالج ٹوٹا تو اکسٹرا اسسٹنٹ مقرر ہوئے۔ (کتاب مولانا محمد احسن نانوتوی۔ ص ۱۴۳۔ ۱۴۴ حاشیہ) انہی کے بارے میں سوانح قاسمی میں لکھا ہوا ہے کہ کالج کی معلمی سے ترقی کرتے ہوئے اکسٹرا اسسٹنٹ تک سرکاری خدمات کے سلسلہ میں پہنچے اور وقت کے حکام کی خوشنودیوں کو حاصل کر کے ہندوستان ہی میں ایل ایل ڈی کی آنریری ڈگری حاصل کی اور بجائے شیخ ضیاء الدین کے شمس العلماء ڈاکٹر شیخ ضیاء الدین کے نام سے مشہور ہو کر مرے۔ (سوانح قاسمی۔ حصہ اول، از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ مکتبہ رحمانیہ لاہور۔ ص ۲۶۹)

مولانا مملوک علی کے ایک اور شاگرد مولوی سمیع اللہ کے متعلق جناب ایوب قادری صاحب لکھتے ہیں۔

مولوی سمیع اللہ خان بن منشی عزیز اللہ ۱۸۳۴ء میں پیدا ہوئے۔ مولانا مملوک

علی سے ان کے گھر پر تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۵۶ء میں منصفی اور وکالت کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۷۴ء میں صدر الصدور مقرر ہوئے ..... ۱۶ ستمبر ۱۸۸۴ء کو مصر میں انگریزوں کے استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیٹیکل مشن پر مصر گئے اور وہاں جمال الدین افغانی کی تحریک کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلہ میں ان کو سی ایم جی (Companion of St Michael and St Gearge) کا خطاب ملا۔ (کتاب مولانا محمد احسن نانوتوی۔ ص ۱۸۴ حاشیہ بحوالہ سوانح عمری مولوی سمیع اللہ خان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی۔ مطبع انوار الاسلام۔ حیدر آباد دکن ۱۹۰۹ء)

مولانا مملوک علی کے ایک اور تربیت یافتہ 'خان بہادر شمس العلماء منشی ذکاء اللہ ..... نے انگریزوں کی خوش آمد کا ذریعہ یہ نکالا کہ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ کے نام سے ایک تاریخ لکھی۔ جس میں انگریزوں کو ہندوستان کا جائز حکمران ثابت کیا اور ان کے بارے میں لکھا کہ اس وقت انگلش مین کی مردانگی عجب نیرنگی دکھا رہی تھی۔ وہ اپنے خدا پر ایسا توکل کرتے تھے اور ان کو بڑا استقلال اور صبر تھا۔ بعض انگریز ایمان کے پکے اور سر تاپا خدا کی عبادت میں مستغرق تھے۔ خان بہادر شمس العلماء نے اس انقلاب (۱۸۵۷ء) کو غدر کہا ..... خان بہادر انگریزوں کو دین دار اور ایمان دار کہتے تھے اور مسلمانوں کو لچے رذیل اور ذلیل قرار دیتے تھے، (غداروں کے خطوط۔ تحقیق و تراجم سلیم قریشی۔ لاہور۔ ۱۹۹۴ء ص ۱۱)

غداروں کے خطوط نامی جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے وہ ان خطوط اور دستاویزات پر مبنی ہے جو انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے متعلق ہیں۔ اس کتاب میں مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور (جن کو احناف بڑے فخر سے اپنے اکابرین میں شمار کرتے ہیں اور جنگ آزادی میں جن کی خدمات کے ترانے گائے جاتے ہیں۔ دیکھئے نقش حیات از حسین احمد مدنی ج ۲۔ بیت التوحید کراچی۔ ج ۲ ص ۴۶۰ اور برق مہریہ۔ مقدمہ از مولانا شبیر احمد ہاشمی، الفہیم پبلی کیشنز، اچھرہ لاہور۔ ص ۱۰) اور مولوی رجب علی کا بھی ذکر ہوا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں حضرات جہاد آزادی کے مخالف اور انگریزوں کے طرف دار اور مددگار تھے۔

جیسا کہ انگریزوں کا ایک جاسوس تراب علی اپنے آقاؤں کو رپورٹ دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

حکیم احسن اللہ خاں، مفتی صدر الدین، مرزا الٰہی بخش...... سب اپنی اپنی اہلیت کے مطابق انگریزی حکومت کی مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ سب کشتیوں کے پلوں کو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ مذکورہ بالا افراد میں کوئی بھی باغیوں کو پناہ دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے برعکس ان کی خواہش ہے کہ جن باغیوں نے قتل وغارت کیا ہے ان کو سخت سزا ملنی چاہیے۔ (غداروں کے خطوط۔ ۱۶۴) تراب علی کی ایک دوسری رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی معرفت مفتی صدر الدین اور انگریزوں کی خفیہ خط وکتابت بھی جاری تھی۔ جیسا کہ اس نے لکھا ہے۔ 'کل میں نے آپ (یعنی انگریز کمانڈر) کے نام مفتی صدر الدین کا ایک خط بھیجا تھا۔' (غداروں کے خطوط۔ ص ۱۵۰)

اسی طرح فتح محمد نامی ایک اور جاسوس یکم ستمبر ۱۸۵۷ء کو اپنے انگریز آقاؤں کو رپورٹ دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

'مفتی صدر الدین کو رقم کی فراہمی کے لئے (بہادر شاہ ظفر کے) دربار میں طلب کیا گیا تھا۔ اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے بہت سے غازیوں کو چوبیس روپے روزانہ کی تنخواہ کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ اس نے نہ صرف بادشاہ کو کوئی رقم دینے سے انکار کر دیا ہے بلکہ دھمکی دی ہے کہ اگر اسے زیادہ مجبور کیا گیا تو وہ شاہی فوج کے خلاف لڑ کر مرنے کو تیار ہے۔ اس نے کہا کہ وہ انگریزی فوج کی نسبت ان لوگوں (مجاہدین آزادی) کے خلاف جہاد کرنے کو ترجیح دے گا۔' (غداروں کے خطوط۔ ص ۱۶۸)

اس رپورٹ کے درج کرنے کے بعد جناب سلیم قریشی صاحب لکھتے ہیں۔ اس سے پہلے ذکر ہے کہ مفتی صدر الدین نے انگریزوں کو خط لکھا تھا۔ اس (فتح محمد کے) خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صدر الدین کی انگریزوں سے ساز باز مکمل ہو گئی ہے جو بادشاہ کی طلبی پر جانے سے انکار کیا گیا ہے۔ (غداروں کے خطوط۔ ص ۱۶۸)

قارئین آپ شاید اس بات سے آگاہ ہوں گے کہ مفتی صدرالدین صاحب مولانا رشید احمد گنگوہی کے محبوب اساتذہ میں سے تھے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ جب ہم دہلی میں پڑھتے تھے۔ 'اس زمانے میں اچھے اچھے استاد دہلی میں موجود تھے۔ مگر ایسے استاد کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواع مختلفہ سے تقریر کر کے شاگرد کے ذہن نشین کر دیں ایک ہمارے استاد مولانا مملوک العلی صاحب اور دوسرے ہمارے استاد مفتی صدرالدین صاحب تھے۔ رحمۃ اللہ علیہما۔' (کتاب 'مولانا محمد احسن نانوتوی' ص ۳۔ ۱۸۲)

اور اوپر ذکر کردہ مولوی رجب علی صاحب کے متعلق انجمن ترقی اردو دہلی کے جناب ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

۷/ اگست ۱۸۵۷ء کو انقلابیوں کے ایک بہت بڑے بارود خانے میں آگ لگ گئی تھی جس میں پانچ سو سے زائد انقلابی اور حریت پسند شہید ہوئے تھے۔ عاشور کاظمی صاحب نے باغیوں کے خطوط کے حوالے سے بتایا ہے کہ یہ عظیم کارنامہ ہمارے محسن مولوی رجب علی کا تھا۔ جو بقول سلیم قریشی آزادی کی جنگ شروع ہوتے ہی اپنی چرب زبانی اور عیاری سے بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کی مشاورتی کونسل کا رکن اور بارود خانے کا داروغہ بننے میں کامیاب ہو گیا تھا۔' (غداروں کے خطوط۔ ص ۸۔ ۷) اس کتاب میں ایک اور جگہ پر مولوی رجب علی کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے۔ 'دہلی کا محاصرہ شروع ہوتے ہی میجر ہوڈسن کی سرکردگی میں مخبروں اور جاسوسوں کی تنظیم کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ میجر ہوڈسن نے اپنے ایک پرانے واقف کار مولوی رجب علی سے جو اس سے پہلے ہنری لارنس کے میر منشی رہ چکے تھے رابطہ کیا۔ مولوی صاحب یہ خدمت انجام دینے پر بخوشی تیار ہو گئے اور انہوں نے یہ خدمت ایسی وفاداری اور جوش و خروش سے انجام دی کہ اندازہ لگانا دشوار ہے۔ وہ دہلی کے عین وسط میں رہتے ہوئے شہر میں موجود باغیوں کے متعلق ہر وہ اطلاع جس کا جاننا ہمارے (انگریزوں) کے لئے ضروری تھا۔ کاغذ کی پرچیوں پر لکھ کر چپاتیوں کے پردوں میں، جوتوں کے تلووں میں، پگڑی کی تہوں میں، سکھوں کے بالوں کے

جوڑوں میں چھپا چھپا کر ہم تک بھیجتے رہے۔ اس طرح باغیوں کے مورچوں اور منصوبوں کی اطلاع ہمارے کمانڈروں تک بروقت پہنچاتے رہے۔ (Punjab & Delhi by C Brown Vol 1 pp 339.340) (غداروں کے خطوط۔ ص ۶۷۔۶۶) یہ اقتباس نقل کرنے کے بعد عاشور کاظمی صاحب لکھتے ہیں۔ یہ تھی رجب علی کے کردار کی جھلک دوسروں کی زبانی۔ اب رجب علی کی اپنی زبانی بحوالہ تحقیقات چشتیہ (باغیچہ رجب علی) مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء دیکھئے کہ وطن کو دوسروں کی غلامی میں دینے والا خود القابات و خطابات کا کتنا اسیر تھا۔ (وہ کہتا ہے کہ) بعد تسخیر دہلی بحصول رخصت وطن آیا۔ جب جارج کارنک صاحب بہادر کمشنر ایں روئے ستلج نے رپورٹ اہل خدمت کی تو پیش گاہ لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل کشور ہند وائسرائے سے خلعت پانچ ہزار روپیہ بذریعہ بندگان حضور سر جان لارنس صاحب بہادر گورنر جنرل مرحمت ہوا۔ اور کچھ جاگیر عطا ہوئی اور خطاب ارسطو جاہ کا ملا۔ اور خطاب خان بہادر کا مہم لاہور میں پیش گاہ لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل سابق سے عطا ہوا تھا...... جناب باری اس دولت انگلشی کو روز بروز ترقی بخشے کہ طرح طرح کی ترقیات کشور ہندوستان میں 'بہ نسبت نیک حکام سپہر مقام' عمل میں آئیں۔' (غداروں کے خطوط۔ ص ۶۷)

ادھر قادیان میں بھی احناف کا ایک خاندان رہتا تھا جنہیں مغل بادشاہوں سے جاگیر ملی ہوئی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں اس خاندان کی سربراہی مرزا غلام مرتضٰی کے ہاتھ میں تھی۔ اس شخص نے مسلم مفادات سے غداری کرتے ہوئے انگریزوں کا ساتھ دیا اور کہا جاتا ہے کہ مجاہدین آزادی کو کچلنے کے لئے اس نے ۵۰ گھوڑے اور سپاہی انگریزوں کی نذر کئے جس کے بدلے میں اس نے تعریفی سندات حاصل کیں۔ اس کا بیٹا مرزا غلام احمد جو اپنے دعوی مسیحیت و نبوت سے پہلے خود بھی حنفی المسلک تھا ساری عمر ان سندات کو سفر و حضر میں ساتھ لئے پھرتا رہا۔ اس خاندان کے حنفی ہونے کی شہادت حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑوی کی سوانح حیات مہر منیر مرتبہ مولوی فیض احمد میں موجود ہے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں احناف اکابرین کے اس طرز عمل کی وجہ شاید یہ روایت ہے جو نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان شروانی سے مختلف موقعوں پر سن کر مولانا مناظر احسن گیلانی نے سوانح قاسمی میں نقل کی ہے۔ انگریزوں کے مقابلے میں جو لوگ لڑ رہے تھے ان میں حضرت مولانا شاہ فضل الرحمان گنج مراد آبادی بھی تھے۔ اچانک ایک دن مولانا کو دیکھا گیا کہ خود بھاگے جا رہے ہیں اور کسی چودھری کا نام لے کر جو باغیوں کی فوج کی افسری کر رہے تھے کہتے جاتے تھے کہ لڑنے کا کیا فائدہ۔ خضر کو تو میں انگریزوں کی صف میں پا رہا ہوں۔ (مولانا گیلانی کا کہنا ہے کہ) نواب (شروانی) صاحب ہی دوسرے واقعہ کا ذکر بھی فرماتے تھے کہ غدر کے بعد جب گنج مراد آباد کی ویران مسجد میں حضرت مولانا (فضل الرحمان) جا کر مقیم ہوئے تو اتفاقا اسی راستے سے جس کے کنارے مسجد ہے کسی وجہ سے انگریزی فوج گزر رہی تھی۔ مولانا مسجد سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک مسجد کی سیڑھیوں سے اتر کر دیکھا گیا کہ انگریزی فوج کے ایک سائیس سے جو باگ ڈور کھونٹے وغیرہ گھوڑے کا لئے ہوئے تھا اس سے باتیں کر کے پھر واپس آ گئے۔ اب یاد نہیں رہا کہ پوچھنے پر یا خود بخود فرمانے لگے کہ سائیس جس سے میں نے گفتگو کی یہ خضر تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا حال ہے؟ تو جواب میں (خضر نے) کہا حکم یہی ہوا ہے، مولانا حافظ صلاح الدین یوسف ان روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ 'جب ان (احناف) کے بزرگ کو روحانی کشف کے ذریعہ حضرت خضر کا نہ صرف انگریزوں کی حمایت و رفاقت کا بلکہ حضرت خضر کے انگریزی فوج کے ادنی خادم (سائیس) ہونے کا علم ہو گیا تو اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ انگریزی فوج کو نصرت ایزدی اور تائید غیبی حاصل تھی۔ اب ایسے مؤید من اللہ (انگریزوں) سے بھلا علمائے احناف کیوں کر برسر پیکار ہوتے اور ان کے خلاف جدو جہد کر کے کیوں غضب الٰہی کا مورد بنتے۔ (تحریک جہاد۔ مولانا حافظ صلاح الدین یوسف۔ گوجرانوالہ۔ ۱۹۸۵ء۔ ص ۷۰۔ ۶۹)

قارئین جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں احناف کے سر بر آوردہ افراد کا منفی کردار اتنا ظاہر و باہر ہے کہ اس کو چھپانا خود دیوبندی اہل قلم کے لئے بھی مشکل ہو چکا ہے۔

جیسا کہ پروفیسر ایوب قادری صاحب مولانا محمد احسن نانوتوی کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ 'جنگ آزادی ۱۸۵۷ء مسلمانان برصغیر کی وہ منظم اور ہمہ گیر تحریک تھی جس کے ذریعے سے انہوں نے غیر ملکی اقتدار سے ملک و قوم کو آزاد کرانے کی پوری پوری کوشش کی۔ روہیل کھنڈ کا صدر مقام بریلی روہیلوں کا صدر مقام رہ چکا تھا۔ لہٰذا یہ مقام جلد ہی تحریک آزادی کا مرکز بن گیا ـــــ (اس شہر میں) ۲۲ر مئی ۱۸۵۷ء کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن نے بریلی کی مسجد نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ (انگریزوں کی) حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے۔ (کتاب مولانا احسن نانوتوی۔ ص ۵۰) اس کے بعد قادری صاحب لکھتے ہیں کہ اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگادی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن کے خلاف ہوگئے۔ اگر مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو ان کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔

اس دور کے مشہور علمائے احناف میں ایک بزرگ مولانا شیخ محمد تھانوی ہوا کرتے تھے۔ آپ حاجی امداد اللہ صاحب کے پیر بھائی اور میاں جی نور محمد جھنجھانوی کے خلفاء میں سے تھے۔ ان کے متعلق مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں۔ 'بد قسمتی سے مولانا کی رائے یہ ہی تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال (جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں) جائز ہی نہیں۔' (نقش حیات۔ حسین احمد مدنی بیت التوحید کراچی۔ جلد دوم۔ ص ۴۵۱) جناب ایوب قادری صاحب بھی فرماتے ہیں کہ 'مولانا شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف رائے دی۔' (محمد احسن نانوتوی۔ ص ۵۳) (اس کے بعد قادری صاحب لکھتے ہیں کہ بعد میں مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہی رائے ظاہر کی۔ کتاب مذکور ص ۵۴ حاشیہ)

شیخ محمد تھانوی صاحب نے جس مجلس میں درج بالا رائے ظاہر کی تھی اس کی کچھ تفصیلات سوانح قاسمی میں مولانا قاری محمد طیب مہتمم دیوبند کی سیاسی یادداشت کی صورت میں ملتی ہیں۔ قاری صاحب کہتے ہیں کہ 'تھانہ میں مجلس شوریٰ قائم ہوئی جس میں حضرت گنگوہی اور دوسرے علماء شریک تھے...... اس مجلس میں باہم علمی گفتگو چھڑی...... اس موقع پر جہاد کے سب خلاف تھے۔ صرف حضرت نانوتوی

مدعیانہ طریق پر اس میں پیش پیش تھے (سوانح قاسمی۔ حصہ دوم ص ۲۔۱۳۱) اور قارئین یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اس مجلس میں مولانا گنگوہی کے علاوہ حافظ ضامن، شیخ محمد تھانوی، حاجی امداد اللہ وغیرہم بھی شامل تھے۔ اور اس روایت کی رو سے یہ سب مخالفین جہاد قرار پاتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں دیوبندی احناف کے اکابرین کے کردار پر کچھ روشنی تذکرۃ الرشید کے مطالعہ سے بھی پڑتی ہے۔ یہ کتاب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے اور ایک مشہور دیوبندی عالم مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی تالیف ہے اور رباقی علماء دیوبند سے سند یافتہ ہے جیسا کہ سوانح قاسمی میں اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے 'حضرت گنگوہی کی سوانح عمری تذکرۃ الرشید جسے مولانا عاشق الٰہی نے مرتب فرما کر جماعت دیوبند کے ذمہ دار بزرگوں کی خدمت میں پیش کیا۔ اور کافی تنقیح و تحقیق کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی۔' (سوانح قاسمی حصہ دوم۔ مکتبہ رحمانیہ لاہور۔ ص ۹۹) اور اس کتاب میں جو علماء دیوبند کی مصدقہ اور سرکاری کتاب ہے جنگ آزادی کے بارے میں لکھا ہے 'جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انہوں نے کمپنی بہادر (انگریز حکومت) کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم بلند کیا۔' (تذکرۃ الرشید۔ ادارہ اسلامیات لاہور۔ ۱۹۸۶ء جلد ۱۔ ص ۷۳) اور 'ایک مرتبہ ایسا اتفاق بھی ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولانا گنگوہی) اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم (محمد قاسم) اور طبیب روحانی حضرت حاجی صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں سے مقابلہ ہوگیا۔ یہ نبرد آزما جتھہ اپنی سرکار (انگلشیہ) کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لئے اٹل پہاڑ کی طرح پیر جما کر ڈٹ گیا...... حضرت حافظ ضامن صاحب زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔' (تذکرۃ الرشید ج ا ص ۵۔۷۴) اور اس کتاب کے صفحہ ۷۶ پر لکھا ہے 'جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا اور رحمدل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پا کر باغیوں کی سرکوبی شروع کی۔' اور صفحہ ۷۹ پر لکھا ہے 'آپ حضرات (مولانا گنگوہی

اور مولانا قاسم نانوتوی) اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے۔ تازیست خیر خواہ ہی ثابت رہے۔ آپ پر جماعت مفسدین کی شرکت کا محض الزام ہی الزام اور بہتان ہی بہتان ہے۔

قارئین۔ مجاہدین آزادی کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت میں چند افراد کا کردار آپ نے ملاحظہ فرمایا جو آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کے اس دور کی بات ہے جب کہ علمی اور سیاسی حلقوں میں ابھی مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ اور بات ابھی چند افراد پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس دور میں جہاد کے منسوخ یا معطل ہونے کی رائے اور بھی بہت سے علمائے احناف نے دی ہے جیسا کہ پروفیسر ایوب قادری صاحب نے اس دور کے ایک اور حنفی عالم مولانا کرامت علی جونپوری کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت سید احمد شہید کی 'تحریک سے الگ ہو کر انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتوی دیا۔' (تذکرہ علمائے ہند۔ ترجمہ: ایوب قادری ص ۲۹۶۔ منقول از تحریک جہاد۔ حافظ صلاح الدین یوسف۔ ص ۵۸ حاشیہ) یہ فتوی در اصل ایک تقریر ہے جو ایک مذاکرہ علمیہ میں موصوف نے کی تھی۔ جس کی روئیداد بعد میں 'اسلامی مذاکرہ علمیہ' کے نام سے چھپی تھی۔ موصوف نے اپنی اس تقریر میں اس عقیدے کو کہ ہندوستان دار الحرب ہے صرف وہابیوں کا عقیدہ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ تمام حنفیوں کے نزدیک ہندوستان دار الاسلام ہے۔ (مذاکرہ علمیہ۔ نول کشور لکھنؤ۔ ۱۸۷۰ء منقول از تحریک جہاد۔ حافظ صلاح الدین یوسف۔ ص ۵۸)

اس مذاکرہ علمیہ میں جن مزید حنفی علماء کے جہاد کے خلاف فتوے درج ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا عبد الحئی لکھنوی، مولانا محمد علی لکھنوی، مولانا فیض اللہ لکھنوی، مولانا رحمت اللہ لکھنوی، مولانا قطب الدین لکھنوی، مفتی سعید اللہ لکھنوی، مولانا لطیف اللہ رامپوری، مولانا غلام علی رامپوری۔ ان علماء کے فتوی میں کہا گیا ہے کہ مسلمان عیسائیوں کی امان میں ہیں اور اس ملک میں جہاد واجب نہیں جہاں اہل اسلام کو پناہ حاصل ہو۔ ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے تو اس میں مسلمانوں کی فتح اور

برتری کا قیاس غالب ہو۔ اگر اس قسم کے قیاس کا امکان نہ ہو تو جہاد ناجائز ہے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ منقول از حیات میاں نذیر حسین محدث از پروفیسر محمد مبارک۔ کراچی۔ ص ۳۔ ۸۲)

نواب سید صدیق حسن مرحوم نے بھی اس بحث مباحثہ کا ذکر کیا ہے جو جہاد کے بارے میں اس دور کے احناف میں ہو رہا تھا۔ آپ لکھتے ہیں۔ ۱۲۸۷ھ یا ۱۸۷۱ء میں جب کہ چند صاحبان انگریز نے اس امر پر بحث شروع کی تھی کہ فرقہ وہابیہ کے مسائل ہمارے سلطنت میں ذریعہ فساد ہو سکتے ہیں۔ اس وقت مولوی عبداللطیف خاں بہادر مجسٹریٹ کلکتہ نے اس خیال کے رد میں عام مسلمانوں کی طرف سے ایک رسالہ مشتہر کیا تھا اور اس میں عام اطراف ہندوستان کے عالموں اور نیز علماء مکہ و مدینہ وغیرہ کے فتوے نقل کئے تھے جس سے سرکار کو معلوم ہو جاوے کہ تمام فتاوی مذکورہ کی رو سے کل مسلمانوں کو سرکار کی مخالفت ناجائز ہے اور کسی شخص کو حیثیت موجودہ پر ہندوستان کے دارالاسلام ہونے میں شک نہ رہے۔ (ترجمان وہابیہ۔ طبع لاہور۔ ۱۳۱۲ھ ص ۴۸)

ڈاکٹر بہاء الدین

برطانوی ہند میں تنسیخ جہاد کی بحث

اس دور کے ایک حنفی عالم ڈپٹی نذیر احمد نے انگریزوں کو اولوالامر قرار دیا..... سر ولیم میور نے ڈپٹی نذیر احمد کو اولوالامر کی تفسیر پر شمس العلماء کا خطاب دلوایا اور ایڈنبرا یونیورسٹی سے ایل ایل ڈی کی ڈگری دلوائی۔

(ابوالکلام آزاد۔ از شورش کاشمیری۔ ص ۴۰۳)

قارئین یہ وہ ماحول تھا جب مولانا محمد حسین بٹالوی نے بھی وہی رائے ظاہر کردی جو احناف تقریباً ۵۰ سال سے کرتے چلے آرہے تھے۔ جیسا کہ نواب صدیق حسن صاحب فرماتے ہیں۔

۱۸۵۷ء مولوی محمد حسین سرگروہ موحدین لاہور نے بجواب وسوال ومسئلہ اور اس فتوی کے کہ آیا بمقابلہ گورنمنٹ ہند مسلمانان ہند کو جہاد کرنا اور اپنی مذہبی تقلید میں ہتھیار اٹھانا چاہیے یا نہیں۔ یہ جواب دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ جہاد اور جنگ مذہبی بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند بالمقابلہ اس حاکم کے جس نے آزادی مذہبی دے رکھی ہے از روئے شریعت اسلام عموماً خلاف وممنوع ہے۔ (ترجمان وہابیہ ص ۶۱) پھر بٹالہ سے بات لدھیانہ پہنچی اور وہاں کے علماء نے سلطنت انگلشیہ بہتر ہے یا حکومت روس؟ کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے فرمایا کہ سلطنت انگلشیہ بہتر ہے کیونکہ سرکار دولت مدار مثل روس متعصب نہیں۔ اگر بالفرض والتقدیر سرکار کی عملداری مملکت روس وغیرہ سے بہتر نہ سمجھی جائے تب بھی رعایائے اہل اسلام کو شرعاً حرام ہے، (نصرۃ الابرار۔ ص ۹ منقول از علمائے دیوبند کا ماضی۔ حکیم محمود احمد۔ گوجرانوالہ۔ ص ۱۳۱۱) اور مولوی عبداللہ لدھیانوی ایک جگہ فرماتے ہیں "چونکہ خدا تعالیٰ کے فضل وکرم سے سرکار دولت مدار

(انگریز حکومت) ہمارے دینی امور میں حارج نہیں اس امر کا شکریہ ادا کر کے حاکم وقت سے اس امر کی التجا کرنی چاہیے کہ ایک ایک قاضی و مفتی شہروں میں اور ایک ایک نائب ان کا قصبات میں مقرر کیے جاویں۔ (فتاوی قادریہ۔ طبع لاہور ص ۵۲۔۵۱)

قارئین! حضرۃ الامام ابوحنیفہ جنہوں نے ایک مسلمان بادشاہ کا پیش کردہ عہدہ قضاۃ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا ان کے بزعم خود نام لیواؤں اور ان کی فقہ پر بقول خود عمل کرنے والے ان لدھیانوی علماء سے جو ایک کافر حکومت سے حیلوں بہانوں سے قضاۃ کے عہدے مانگ رہے ہیں آگے چلیں تو بانس بریلی کے مولانا شاہ احمد رضا خاں صاحب پر نظر رکتی ہے۔ جنہوں نے اعلام الاسلام کے عنوان سے ایک فتوی صادر فرمایا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود صاحب (جو اس بزرگ کے بڑے عقیدت مندوں میں سے ہیں) بتاتے ہیں کہ 'رسالہ اعلام الاسلام دراصل ایک فتوی ہے جس میں متعدد سوالات کے جوابات ہیں۔ استفتا تین سوالات پر مشتمل ہے جو ۱۸۸۰ء (۱۲۹۸ھ) میں بدایوں سے مرزا علی بیگ نے بریلی ارسال کیا تھا۔ مولانا بریلوی پہلے سوال کے جواب میں لکھتے ہیں۔ ہمارے امام اعظم رضی اللہ بلکہ علمائے ثلاثہ رحمہم اللہ علیہم اجمعین کے مذہب پر ہندوستان دارالاسلام ہے۔ ہرگز دارالحرب نہیں کہ دارالاسلام کے دارالحرب ہو جانے میں جو تین باتیں ہمارے امام اعظم امام الائمہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک درکار ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں احکام شرک اعلانیہ جاری ہوں۔ اور شریعت اسلامیہ کے احکام و شعائر مطلقاً جاری نہ ہونے پائیں۔ اور صاحبین کے نزدیک اس کی قدر کافی ہے۔ مگر یہ بات بحمد اللہ یہاں (برطانی ہند میں) قطعاً موجود نہیں۔ (حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی۔ از ڈاکٹر محمد مسعود سیالکوٹ۔ ۱۹۸۱ء ص ۴۔۱۷۳) (ڈاکٹر مسعود صاحب اس کے بعد لکھتے ہیں کہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی اور مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہی فتوی دیا تھا۔ اور حوالہ کے طور پر انہوں نے مجموعہ فتاوی، عبدالحیٔ لکھنوی، مطبوعہ لکھنو ۱۳۴۰ھ، ۱۹۲۱ء ج ۱، ص ۲۰۳ اور تحذیر الاخوان از مولانا اشرف علی تھانوی، ص ۹۔۷ کا ذکر فرمایا ہے۔)

قارئین! بریلی سے ذرا آگے نکلیں تو مدرسہ دیوبند اور گنگوہ کے وہ علماء سامنے آتے

ہیں جن کے بارے میں انگریزی سی آئی ڈی کی رپورٹ مولانا محمد میاں دیوبندی نے یوں نقل کی ہے۔ 'سب سے گراں قدر فیصلہ وہ فتویٰ ہے جو ۱۸۹۸ء میں مرحوم رشید احمد گنگوہی نے جاری کیا تھا۔ کیونکہ اس پر دوسرے علماء کے علاوہ مولانا محمود الحسن کے بھی دستخط ہیں کہ مسلمان مذہبی طور سے پابند ہیں کہ حکومت برطانیہ کے وفادار رہیں۔ خواہ آخر الذکر سلطان ترکی ہی سے برسر جنگ کیوں نہ ہو۔ (تحریک شیخ الہند از محمد میاں، مکتبہ رشیدیہ کراچی، ۱۹۸۸ء ص ۱۵۵)

قارئین! حضرت گنگوہی کو انگریز حکومت خطاب سے بھی نوازنا چاہتی تھی۔ وہ تو ایک دیسی افسر تھا جس نے اپنی ذاتی ناراضگی کے باعث یہ بیل منڈھے نہ چڑھنے دی جیسا کی ارواح ثلاثہ میں لکھا ہے۔ ایک ڈپٹی صاحب مولانا گنگوہی کے پاس حاضر ہوئے۔ مولانا معمولی گفتگو کر کے درس میں مشغول ہو گئے اس پر ان کو رنج ہوا اور دوسروں سے شکایت کی کہ بڑے برے اخلاق ہیں۔ سنا ہے کہ سال کے ختم یا شروع پر گورنمنٹ کی طرف سے کچھ خطابات تقسیم ہوتے ہیں تو مولانا (گنگوہی) کے لئے بھی شمس العلماء کا خطاب تجویز ہوا تھا۔ اس میں ان ڈپٹی صاحب سے بھی پوچھا گیا۔ چونکہ یہ حاکم پرگنہ تھے۔ تو انہوں نے مخالفت کی کہ مناسب نہیں۔ اس پر ڈپٹی صاحب نے خوش ہو کر مولانا کے آدمیوں سے فرمایا کہ ہم سے مولانا اچھی طرح نہ ملے۔ ہم نے بھی خطاب نہ ملنے دیا۔' (ارواح ثلاثہ، لاہور، ۱۹۷۶ء ص ۳۱۸۔۳۱۷)

مولانا گنگوہی سے آگے چلیں تو اس دور کے ایک حنفی پیر صاحب نظر آتے ہیں۔ ان کا اسم گرامی پیر مہر علی شاہ صاحب ہے۔ آپ دیوبندیوں کے استاذ الاساتذہ مولانا احمد علی سہارنپوری کے شاگرد اور احناف کے شیخ المشائخ حاجی امداد اللہ صاحب کے خلیفہ ہیں۔ ان کو ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم کے دہلی دربار میں حاضری کا پروانہ ملا تو انہوں نے 'کمشنر کی روبکار پر تحریر فرمایا کہ میں ایک درویش ہوں اور درویشوں کی حاضری شاہی درباروں میں کبھی مناسب خیال نہیں کی گئی۔ تاہم اس حکومت میں ہمارے سچے مذہب اسلام کے ارکان پر کوئی پابندی نہیں۔ اس لئے میں بادشاہ کے حق میں یہیں سے دعا کرتا ہوں۔' (مہر منیر۔ مولوی فیض احمد۔ طبع پنجم۔ ص ۲۸۳) انگریزوں کے حق

میں دعائیں کرنے کا پیر مہر علی کا یہ فعل کوئی انفرادی فعل نہیں تھا بلکہ اس گدی کا سرکاری عمل لگتا ہے کیونکہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحبزادے اور جانشین حضرت بابوجی نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔ جیسا کہ ایک حنفی اہل قلم نے خود اعتراف کیا ہے کہ 'کچھ مشائخ پنجاب نے انگریزی گورنر جنرل ڈائر کو سپاسنامہ پیش کیا تھا اس پر بابوجی کے دستخط بھی تھے۔' (برق مہریہ۔ الفہیم پبلی کیشنز، فیروز پور روڈ، لاہور، تقدیم از سید شبیر احمد ہاشمی ص ۲۳)

ناظرین انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں ایک حنفی عالم جناب خان بہادر مولوی عبدالاحد آنریری مجسٹریٹ مالک مطبع مجتبائی نظر آتے ہیں۔ ان کے بارے میں پروفیسر ایوب قادری صاحب لکھتے ہیں 'پہلی جنگ عظیم میں مولوی عبدالاحد نے حکومت برطانیہ کی بے مثال خدمت انجام دی۔ انہوں نے وارفنڈ میں دل کھول کر چندہ دیا اور تقریباً تین لاکھ روپیہ قرضہ جنگ میں دیا۔ انہوں نے سٹی ریکروٹنگ کمیٹی اور پبلسٹی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ برطانیہ نے مولوی عبدالاحد مرحوم کو خلعت سند اور خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔ ۲ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو مولوی عبدالاحد کا انتقال ہوا۔ اس زمانے میں خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ حکام رس اور خطاب یافتہ حضرات کو لوگ اچھی نظروں سے نہ دیکھتے تھے۔ لہٰذا بعض لوگوں نے مولوی عبدالاحد مرحوم کی میت کی تدفین میں سخت رکاوٹیں ڈالیں۔' (کتاب محمد احسن نانوتوی۔ ص ۱۶۵)

ذرا آگے چلیں تو برصغیر کے نامور حنفی عالم علامہ شبلی نعمانی نظر آتے ہیں جنہوں نے حنفیت کے جوش میں امام ابوحنیفہ کی وفات کے تقریباً ساڑھے گیارہ سو سال بعد ان سے چالیس افراد پر مشتمل تدوین فقہ کمیٹی بنوادی تھی۔ آپ کے بارے میں ایک اور دیوبندی عالم مولانا عبدالماجد دریا بادی مصنف تفسیر ماجدی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے اپنے ہاں بلایا جب میں ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو (مولانا شبلی) 'بہت دیر تک تخلیہ میں گفتگو کرتے رہے۔ ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ آج کل مجھ سے بدظن ہے۔ خصوصاً معاملہ کانپور کے متعلق میری نظموں سے۔ حاذق الملک حکیم اجمل

خان مجھے آج مسٹر برن چیف سیکریٹری کے پاس لے گئے تھے۔ وہ بہت کبیدہ خاطر تھے۔ حالانکہ اس سے پیشتر (مسٹر برن) نہایت اخلاق و تپاک سے ملتے تھے۔ تم ان کے نام ایک مفصل چٹھی اس مضمون کی میری طرف سے لکھ دو کہ میں مدۃ العمر کبھی انگریزی حکومت کا بدخواہ نہیں رہا ہوں...... ۱۹۰۸ء میں میں نے الندوہ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا کہ مسلمان پر انگریزی حکومت کی اطاعت و فرمانبرداری مذہبا فرض ہے اور اسی سال ندوہ کے سالانہ جلسہ میں وفاداری کا ایک ریزولیوشن بھی پاس کرایا۔' (حیاۃ شبلی از سید سلیمان ندوی، طبع چہارم، اعظم گڑھ، ص ۶۳۵-۶)

ذرا اور آگے بڑھیں تو تفسیر حقانی کے مصنف مشہور حنفی عالم مولانا عبدالحق حقانی صاحب نظر آتے ہیں۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے 'گورنمنٹ پرستوں کا فتنہ' کے زیرعنوان مولانا محمد میاں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔ 'وہی ترکی جس کو انگریز نے اپنی ضرورت کے وقت مسلمانوں کا خلیفہ قرار دیا تھا..... اب وہی ترکی چونکہ میدان جنگ میں انگریز کے مقابلہ پر تھا تو اس کو فاسق فاجر قرار دے کر خلافت کا غیر مستحق گردانا۔ گورنمنٹ پرست مولویوں نے فتوے مرتب کئے۔ مولوی عبدالحق حقانی اس فتوے کے موجد اور مؤلف تھے۔' (علماء ہند کا شاندار ماضی، ج ۵، مکتبہ رشیدیہ کراچی۔ ص ۱۲۵)

آگے چلیں تو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم خامس مولانا محمد احمد اور مہتمم سادس مولانا حبیب الرحمان نظر آتے ہیں۔ ان کے بارے میں ابوسلمان شاہجہان پوری صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا عبیداللہ سندھی کے خلاف مولانا شبیر احمد عثمانی کو آمادہ پیکار کرنے اور ان پر کفر کا فتوی لگوانے میں مولانا محمد احمد کا دست کرم پوشیدہ تھا۔ حضرت شیخ الہند کے خلاف سہارنپور کے کلکٹر کی معرفت گورنمنٹ میں مولانا محمد احمد کی رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں اور انہیں ریشمی رومال سازش کیس کی ڈائریکٹری میں انگریز حکام نے اپنا آدمی بتایا ہے۔ اور مولانا حبیب الرحمان مولانا محمد احمد کے ہم خیال و ہم مسلک تھے۔ اور ریشمی رومال سازش کیس کی ڈائریکٹری میں حکام نے ان کو اپنے وفاداروں میں شمار کیا ہے۔ (تحریک شیخ الہند محمود الحسن از ابوسلمان شاہ جہاں پوری، کراچی، ۱۹۸۸ء ص ۸-۱۶۷۔

نیز تحریک شیخ الہند، کراچی ۱۹۸۸ء ص۱۵۴ اور ۵۴۴)

قارئین! جیسا کہ ہم نے پہلے بتایا ہے۔ برصغیر میں جہاد کے جواز وعدم جواز کی غزل کا مطلع میر محبوب علی دہلوی حنفی نے موزوں کیا تھا۔ ان کے بعد مختلف ادوار میں مختلف افراد اس زمین سخن میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ تاانکہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں مولانا محمود حسن اور دیگر علمائے دیو بند نے باہم ملکر فکر سخن فرمائی اور اس غزل کا مقطع موزوں فرمایا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں جو لوگ انگریز کے خلاف اعلانیہ یا در پردہ جدوجہد میں مصروف تھے انہوں نے مولانا محمود حسن کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں کہ ۱۹۱۴ء میں 'حضرت مولانا محمود الحسن سے میری ملاقات بھی دراصل اسی طلب وسعی کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے پہلی ہی صحبت میں کامل اتفاق ظاہر فرمایا تھا اور معاملہ بالکل صاف ہوگیا تھا کہ وہ اس منصب (امارت شرعیہ) کو قبول کرلیں گے۔ اور ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کردیا جائے گا۔ مگر افسوس کہ بعض زود رائے اشخاص کے مشورہ سے مولانا نے اچانک سفر حجاز کا ارادہ ظاہر کردیا اور میری کوئی منت سماجت بھی انہیں سفر سے باز نہ رکھ سکی۔' (خطبات ابوالکلام، مرتبہ مالک رام، اسلامک پبلشنگ ہاؤس لاہور، ص ۱۳۷)

اور حجاز میں جو کچھ ہوا وہ دور حاضر کے ایک دیوبندی عالم مولانا زاہد الراشدی کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں: 'جس وقت شریف مکہ حسین بن علی نے ترکوں کی خلافت کے خلاف بغاوت کو جائز قرار دلوانے کے لیے اپنے ہم نوا علماء سے فتویٰ لیا تو دیوبندی جماعت کے سربراہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اس وقت حرمین شریفین میں تھے۔ ان سے بھی فتوی پر دستخط کا تقاضا کیا گیا۔ مگر انہوں نے انکار کردیا۔ اسی کی پاداش میں شریف مکہ نے انہیں گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کردیا اور وہ اپنے رفیق مولانا حسین احمد مدنی مولانا عزیر گل اور دیگر ساتھیوں کے ہمراہ مالٹا جزیرے میں ساڑھے تین سال تک نظر بند رہے۔

یہ تحریر اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ مالٹا میں نظر بندی جہاد آزادی کی کسی تحریک

میں شمولیت کی بنا پر عمل میں نہیں آئی تھی۔ بلکہ اس کی وجہ ترکوں اور شریف مکہ کی باہمی کشمکش میں شریف کا ساتھ نہ دینے کا شاخسانہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا محمود حسن نے مالٹا سے جو درخواستیں انگریزوں کو بھجوائیں ان میں وہ کہتے تھے کہ جب میں واقع میں مجرم نہیں ہوں تو مجھے رہا کیا جانا چاہئے یا مصر وغیرہ کسی ملک میں رکھا جانا چاہئے۔ دوسری طرف علمائے دیوبند بھی اسی بنا پر ان کی رہائی کی درخواستیں دے رہے تھے کہ مولانا تو سیاسی جدوجہد اور تحریکوں سے دور رہے ہیں اس لیے انہیں رہا کیا جانا چاہئے۔ علماء دیوبند کی یہ کوششیں ۱۹۱۷ء کے وسط میں عروج پر تھیں اور انہوں نے کئی مہینوں کی کوشش کے بعد انگریز گورنر سے ملاقات کا وقت لیا اور نومبر ۱۹۱۷ء میں اس کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے یکم نومبر کو مولانا محمود حسن صاحب کو مالٹا خطوط بھی لکھے جن میں بتایا کہ وہ ان کی رہائی کے لیے کیا کچھ کررہے ہیں۔ ذیل میں ہم آپ کو یہ داستان سناتے ہیں اور اس کا آغاز مولانا محمود حسن کے خط سے کرتے ہیں جو انہوں نے مالٹا سے منتظمین دارالعلوم دیوبند کے نام لکھا تھا۔ یہ خط یوں ہے:

"برادران ومکرم مانم رزقکم اللہ خیراً"

بندہ محمود سلام مسنون کے بعد عرض کرتا ہے۔ آپ حضرات کے آٹھ نو خط جو غالباً سب ۲۳ محرم اور ۱ نومبر کے لکھے ہوئے تھے بندہ کو سب کے سب اب درمیان مارچ کو ملے اور یہ عذر کیا گیا کہ تمہارے یہ خطوط لندن گئے تھے۔ وہاں سے اب واپس آئے۔ اس لیے تاخیر ہوئی۔ مسٹر برن صاحب غالباً ایک ہفتہ سے کم مالٹا میں قیام پذیر نہیں رہے اور اسی عرصہ میں انہوں نے مجھ سے اور میرے رفقاء سے بیانات لئے۔ اور سب نے ان کے استفسارات کے جواب دئے مگر صاحب موصوف نے حالات گذشتہ کے متعلق اکثر سوالات کیے تھے۔ اسی کے مطابق جواب بھی دئے گئے۔ یہ امر جو آپ حضرات کے خطوط سے اب معلوم ہوا اس کا اصلاً تذکرہ نہیں آیا۔ سو اس کا جواب آپ کی خدمت میں ارسال کرتا ہوں۔ یہ اللہ کو معلوم ہے کہ آپ تک کب اور کیوں کر پہنچے۔ الغرض جو تاخیر ہوئی یا آئندہ ہو اس میں معذور ہوں۔ میری طرف سے قصور نہیں۔

آپ حضرات کی جملہ تحریرات کا خلاصہ دو امر سمجھتا ہوں۔ اول ہندوستان آنا منظور کرلوں۔ دوسرے وہاں پہنچ کر اپنے قدیمی مشاغل میں مصروف اور حسب طرز قدیم سیاسیات سے الگ تھلگ رہوں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے مخلص مجھ سے دریافت کرنے سے پہلے ہی ہزآنر سے میری نسبت ان امور کا وعدہ بھی کر چکے ہیں۔ سو میرے مخلص جو میرے قدیم طرز و تعلقات سے واقف ہیں ان کو میرا صرف ہاں یا نعم کہہ دینا ان کے اطمینان کے لیے بالکل کافی ہے۔ اس کی حاجت نہیں کہ طویل مضمون لکھوں۔ مگر تغیرات کا ہجوم ہے اس لیے صرف اپنے مخلصین کے مزید اطمینان کے لیے اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ گو حد حزامت تک پہنچ چکا ہوں مگر اتنا خوب سمجھتا ہوں کہ دوستوں کا اس شان سے مجھ کو پھر ہندوستان بلانا اور میرے جملہ افعال کی کفالت کرنا باہم مترادف ہیں۔ علی ہذا میرا ہندوستان کی مراجعت کو قبول کرنا اور اپنے احباب کے متعلق تمام ان کی خیراندیشوں کو اپنے سر لینا دونوں مساوی ہیں۔ میں نے حاجت سے زائد لکھ دیا کیونکہ الحمد اللہ میرے صحیح مخاطب ہیں۔ یہ آپ حضرات کی جملہ تحریرات کا جواب ہے جو مجھ کو آپ کی پریشانی سے متاثر ہو کر دینا ضروری ہوا۔

(شیخ الہند مولانا محمود حسن، از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، کراچی ۱۹۸۸ء، ص ۸-۱۲۶)

اس خط میں دیوبندی علماء کے خطوط کا ذکر ہے جو انہوں نے یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو شیخ الہند کو لکھے تھے اور جو ان کے جواب میں شیخ الہند نے یہ خط منتظمین دارالعلوم (یعنی مولانا محمد احمد مہتمم اور مولانا حبیب الرحمان نائب مہتمم، دیکھئے کتاب مذکور ص ۱۶۷) کو لکھا تھا۔ اسی دوران علماء دیوبند نے انگریز گورنر سے وقت لے کر مولانا محمود حسن کی رہائی کی درخواست پیش کردی۔ یہ سرگزشت دارالعلوم دیوبند کے ماہنامے الرشید کے مدیر (مولانا سید اصغر حسین) کی زبانی پیش کی جاتی ہے جو انہوں نے رجب ۱۳۳۶ھ کے شمارے میں شائع کی تھی۔ آپ لکھتے ہیں:

''ہم علماء دیوبند کے اس وفد کا حال اختصار کے ساتھ شائع کر چکے تھے جو ۶ نومبر ۱۹۱۷ء کو بمقام میرٹھ بحضور لاٹ صاحب بہادر صوبہ متحدہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور جس نے مودبانہ حضرت مولانا محمود حسن مد ظلہم ودام فیضہم کے متعلق عرض

کیا تھا اور حضور ممدوح نے بکمال تلطف امید افزا جواب دیا تھا۔ ہم یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ وفد کے پیش کرنے کی اجازت حاصل کرنے کے لیے کئی ماہ بیشتر سے تحریک جاری تھی مگر حضور ممدوح کو کثرت اشغال کی وجہ سے قبل از ٦ نومبر اجازت حاضری وفد کا موقع نہ ملا۔ اور یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ وفد نے ممدوح کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی تھی۔ ہم نتیجہ کے منتظر تھے اور اسی وجہ سے وفد کے متعلق صرف بغرض اطلاع اہل اسلام جن کے قلوب حضرت مولانا ممدوح کی نظر بندی سے بے چین تھے۔ اتنے ہی اعلان کو کافی سمجھا تھا کہ وفد نے حاضر ہو کر عرض کیا اور حضرت ممدوح نے حوصلہ افزا جواب عطا فرمایا۔ اور باوجود تقاضائے ہمدردان اس تحریر کو شائع نہ کیا تھا۔ لیکن باوجود انتظار شدید اب تک نتیجہ کا ظہور نہیں ہوا۔ ادھر اکثر حضرات ہم سے اس تحریر کی نقل طلب کرتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس قدر کثرت کے ساتھ نقول کا بھیجنا سہل نہیں ہے۔ اس لیے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس تحریر کو طبع کر کے شائع کر دیا جائے۔ اس تحریر کو دیکھ کر وہ حضرات بھی اپنا اطمینان فرمالیں جن کو بعض روایات غلط کی بنا پر یا بعض اپنے تخیلات ذاتی سے یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ علماء وفد نے حضرت مولانا کے مجرم ہونے کو تسلیم کر کے درخواست ترحم پیش کی تھی۔ تحریر خود اپنے مضمون کو بتلاتی ہے۔ اور زبانی بھی جو عرض کیا گیا تھا وہ یہی تھا کہ مولانا کی طرف جو خیالات منسوب کئے جاتے ہیں۔ مولانا کا یہ طریقہ کبھی نہیں ہوا۔ اور اس کی تائید میں حضرت مولانا کے قلم کا لکھا ہوا فتویٰ دکھلا چکے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تحریراً و تقریراً ادب حکومت کو ملحوظ رکھ کر عرض کیا گیا تھا۔ اور اسی طریقہ کو ہم نے پسند کیا۔"

اس تعارفی عبارت کے بعد مدیر الرشید نے وہ عرضداشت نقل فرمائی ہے جو علمائے دیوبند نے لاٹ صاحب کے حضور پیش فرمائی تھی۔ یہ عرضداشت یوں ہے:۔

بحضور جناب معلی القاب ہز آنر سر جیمز اسکار جی میسٹن صاحب بہادر کے سی ایس آئی لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ۔

حضور والا ہم چند خدام دارالعلوم دیوبند بحیثیت ایک خالص مذہبی جماعت کی

مرکزی نمائندگی کے آج ایک ایسے اہم مسئلہ کی طرف ہز آنر کی توجہ گرامی منعطف کرانا چاہتے ہیں۔ جو اپنی بعض سیاسی حیثیات سے اگر چہ ہمارے دائرہ بحث کے اندر داخل نہ ہو۔ لیکن اس کا وہ مذہبی پہلو جس کا تعلق دارالعلوم سے اور دارالعلوم کی کارکن جماعت سے اور دارالعلوم کی مدد کرنے والے عام مسلمانوں سے ہے۔ کسی وقت بھی نظر انداز نہیں ہوسکتا۔

حضور والا! ہم اپنی اسی فطری سادگی اور صفائی کی راہ سے (جس نے ایک دور از تکلف کے مذہب کے سایہ میں تربیت پائی ہے اور جس کو ہز آنر کی مہربانی سے گورنمنٹ کے عمل نے بھی آج تک مرہون ضوابط نہیں بنایا) اس وقت جو نہایت مودبانہ گذارش کریں گے۔ ممکن ہے کہ وہ حالات حاضرہ پر نظر کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے ہز آنر کے یا گورنمنٹ کے بعض دوسرے اعلی حکام کے مزاج کو منغض بنادے لیکن سچ یہ ہے (اور سچ ہی ہمیشہ ہم کو کہنا چاہیے) کہ حالات حاضرہ ہی وہ چیزیں ہیں جنہوں نے ہم کو ایک ایسے معاملہ میں دخل دینے کی ہدایت کی ہے۔ جس میں اگر ہم کامیاب ہوجائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مسلمانان ہند کے واحد مذہبی مرکز کا سب سے بڑا اعزاز اور ہندوستان کی عام پبلک کے حق میں نہایت ہی تسکین واطمینان کا باعث اور خود حکام گورنمنٹ کے لیے بھی بجائے اس وقتی تکدر کے بڑی حد تک حقیقی راحت وسہولت حاصل ہونے کی ضمانت اور اس کی مدبرانہ حکمت عملی کا جس سے کہ عام اہل اسلام کے قلوب مسخر ہوجائیں۔ ایک گہرا ثبوت ہوگا۔

ہماری جماعت کے محسن شفیق ہز آنر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب مدرس کی غیر متوقع نظر بندی سے (خواہ وہ گورنمنٹ کے نزدیک کیسی ہی قوی دلیل پر مبنی ہو) دارالعلوم کی اجتماعی حالت کو ایک صدمہ عظیم برداشت کرنا پڑا ہے۔ اور اب بار بار ان کی رہائی کی امیدیں قائم کرتے رہنے کے بعد دارالعلوم کے دوست اور اس کے کثیر التعداد مستفدین ان کی طویل مفارقت سے نہایت ہی بے چین اور شکستہ خاطر ہوکر دارالعلوم کی مرکزی حیثیت اور اس کے سالار قافلہ شمس العلماء مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے رسوخ ووجاہت خداداد سے اپنی آخری امید وابستہ کیے ہوئے

ہیں۔ جس میں اولاً خدا کی رحمت اور ثانیاً ہز آنر کی عنایات خاصہ سے توقع ہے کہ وہ مایوس نہ کیے جائیں گے...

حضور والا۔ تیس چالیس برس کے کامل تجربہ کے بعد ہم کو یہ کہنے میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب ساری عمر تمام جماعت دیوبندی کی طرح سیاسی الجھنوں سے الگ تھلگ رہے۔ نہ تو وہ کوئی وطن پرست آدمی ہیں اور نہ قوم پرست بلکہ ایک سچے خدا پرست انسان ہیں اور انسان جب تک انسان ہے سہو ونسیان اور غلط فہمی کا شکار ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک پاکباز انسان بدنیت نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے ہمارے واسطے اپنے سابق چہل سالہ تجربہ اور حضرت مولانا کے قلم کی لکھی ہوئی بعض تحریروں پر نظر کرتے ہوئے گورنمنٹ صوبہ جات متحدہ کا یہ اعلان کہ "تحریری اور دوسری قسم کی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب نے ہز میجسٹی ملک معظم کے دشمنوں کو ان کی فوجی تجاویز میں مدد دی" اگرچہ نہایت حیرت انگیز اور رنج دہ ہے۔ لیکن جب کہ ان تحریری اور دوسری قسم کی شہادتوں سے واقف ہونے اور ان کو پرکھنے کا ہمارے لیے کوئی موقع نہیں ہے۔ تو ہم راستہ کو مختصر کرنے کے لیے صرف اسی قدر گزارش کرنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر مولانا ممدوح کی آواز گورنمنٹ کے کانوں میں چند سیاسی لوگوں کی آواز کے ساتھ ملتبس ہوکر پہنچی ہے۔ تب بھی وہ ازراہ کرم گستری ورعایا نوازی ایک ایسی شخصیت کے آزاد کرنے میں دریغ نہ کرے۔ جس کی آزادی سے ایک عظیم الشان جماعت اسلام کے جذبات اسیر احسان ہوجائیں گے اور دارالعلوم کے درودیوار میں سے عمیق شکر گذاری کا ایک ایسا ابلتا ہوا جوش نظر آئے گا جو شاید اس سے پہلے کبھی نظر نہ آیا ہو۔

ہم کو ہز آنر کے ان وسیع اخلاق والطاف سے جو آج تک ہماری جماعت کی نسبت کرم فرمائے گئے ہیں۔ کامل یقین ہے کہ ہماری یہ عرضداشت بے اثر نہیں جائے گی اور ہز آنر کوئی مہربانی اس معاملہ میں اٹھا کر نہیں رکھیں گے۔ آخیر میں ہم سمع خراشی کی معافی چاہتے ہیں۔ دعائے کامیابی وفلاح پر اس ناچیز تحریر کو ختم کرتے ہیں۔

ہم ہیں آپ کے صادق خیر اندیش اور وفاکیش علمائے دیوبند ۱۸، محرم ۱۳۳۶ھ

۶ / نومبر ۱۹۱۷ء، الرشید دیوبند رجب ۱۳۳۶ھ

ناظرین! ایسے مضامین جن میں مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کو ان کے جہادی اور انگریزوں کے بارے میں نظریات کے حوالے سے تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے اگر عام قسم کے رسائل میں شائع ہوں تو تعجب نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ایسے رسائل کے مدیروں کی معلومات ناقص ہیں اور شائد تاریخ پر کماحقہ ان کی نظر نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسا مواد دارالعلوم دیوبند کے ایسے رسالے میں شائع ہو جو ایک مدرس دیوبند کی ادارات میں اور موجودہ مہتمم صاحب کی نگرانی میں شائع ہوتا ہے تو ضرور حیرت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ مدیر صاحب اور مہتمم صاحب کے گرد وپیش مدرسہ دیوبند ہی میں کسی نہ کسی جگہ وہ دستاویز پڑی ہوگی جو ہم نے ابھی نقل کی ہے۔ وہاں ماہنامہ الرشید کا رجب ۱۳۳۶ھ کا شمارہ بھی ریکارڈ میں پڑا ہوگا جس میں اس وقت کے تمام دیوبندی علماء نے بحیثیت جماعت خود کو انگریزوں کے خیر خواہ اور وفا کیش قرار دیا تھا اور انگریز حاکم کو اپنا محسن اور شفیق گردانا تھا۔ اور ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۷ء کے چالیس برسوں میں پوری دیوبندی جماعت اپنے شیخ الہند کو ہر طرح کی سیاسی سرگرمیوں اور انجمنوں سے الگ تھلگ قرار دیا تھا۔ مدیر ماہنامہ دارالعلوم اور مہتمم مدرسہ دیوبند کی نظر سے یہ عرضداشت لازماً گذری ہوگی۔ اس عرضداشت کو پڑھنے کے بعد وہ اپنے آپ کو عرق ندامت میں غرق کرنے کی بجائے مفتی نظر کلیم قاسمی صاحب کے اس طرح کے ارشادات شائع کرتے ہیں تو ہم دیوبند کے متوسلین متعلقین اور معتقدین سے گذارش ہی کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے ان بڑوں کو سمجھائیں کہ حضرت اپنے گھر شیشے کا ہو تو دوسروں پر سنگ زنی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

ناظرین! اس مضمون میں ہم نے نظریات عدم فرضیت جہاد، مجاہدین سے عدم تعاون، اور انگریزوں کی حمایت اور وفاداری کے ضمن میں جن افراد کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں مولانا میر محبوب علی دہلوی، مولانا مملوک علی، مولانا محمد مظہر، مولانا محمد منیر، مولانا محمد احسن نانوتوی، خواجہ سلیمان نانوتوی، حاجی امداد اللہ حافظ ضامن، مولانا مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا رجب علی، مولانا شیخ ضیاء الدین، شمس العلوم مولانا ذکاء اللہ،

شمس العلماء، مولانا ڈپٹی نذیر احمد، شمس العلماء، مولانا محمد حسین آزاد، پیرزادہ محمد حسین، خواجہ محمد شفیع، میر ناصر علی، مرزا غلام مرتضی قادیانی، مولانا کریم الدین پانی پتی، مولانا جعفر علی، مولانا سمیع اللہ خاں، مولانا فضل الرحمان گنج مرادآبادی، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا کرامت علی جونپوری، مولانا عبدالحئی لکھنوی، مولانا فیض اللہ لکھنوی، مولانا رحمت اللہ لکھنوی، مولانا قطب الدین لکھنوی، مولانا سعیداللہ لکھنوی، مولانا محمد حسین بٹالوی، مولانا لطیف اللہ رام پوری، مولانا غلام علی رامپوری، مولانا عبداللطیف خاں بہادر، مولانا عبداللہ لدھیانوی ودیگر علمائے لدھیانہ، مولانا شاہ احمد رضا خاں، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمود حسن شیخ الہند، پیر مہر علی شاہ گولڑوی، حضرت بابو جی گولڑوی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دیوبند، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خان بہادر مولوی عبدالاحد، مولانا عبدالحق حقانی، مولانا حبیب الرحمان مہتمم دیوبند، لدھیانہ میں شاہ شجاع کی مسجد کا امام، مطبع حسینی لکھنو کے مالکان، مولانا اصغر حسین مدیر الرشید دیوبند۔

ان لوگوں نے مختلف مواقع پر یا تو جہاد کے عدم جواز پر رائے دی ہے یا ان کے نام مجاہدین کی مخالفت کے ضمن میں لئے جاتے ہیں یا پھر یہ لوگ انگریزوں سے تعاون اور وفاداری کے لیے معروف ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق ان میں صرف مولوی محمد حسین ہی اہل حدیث یا غیر مقلدین میں سے ہیں باقی سب کے سب احناف مقلدین ہیں۔ ۱۸۴۱ء میں جب مولوی محمد حسین پیدا ہوئے تھے اور میر محبوب علی ان کی ولادت سے بھی کم از کم ۱۲ سال پہلے جہاد کے جواز و عدم جواز کی بحث شروع کر کے جہاد کی مخالفت کر چکے تھے۔ اور ۱۸۷۵ء میں جب مولوی محمد حسین صاحب نے تنسیخ جہاد والی اس رائے کا اظہار کیا جس کا ذکر مفتی نظر قاسمی صاحب نے کیا ہے اس وقت تک ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، بے شمار احناف علماء واکابرین تنسیخ وتعطیل جہاد کی رائے کا اظہار کر کے انگریزوں سے تعاون اور وفاداری کا دم بھر چکے تھے۔ مزید یہ کہ بات ۱۸۷۵ء میں مولوی محمد حسین کے فتوے پر ختم بھی نہیں ہوگئی تھی بلکہ اس کے بعد بھی بڑے بڑے علمائے احناف کی ایسی ہی آراء سامنے آتی رہی ہیں (جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں) لیکن مفتی نظر کلیم اور ان کے ہم نواؤں کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کو ساری غزل میں

سے مولوی محمد حسین بٹالوی والا شعر ہی پسند آتا ہے اور ان کے گراموفون کی سوئی ایک ہی جگہ اٹک کر رہ گئی ہے۔ ہم ان سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ گراموفون مشین کی مرمت کروائیں اور وقت نکال کر اس پوری غزل کو سنیں جس کا مطلع ان کے میر محبوب علی صاحب نے موزوں فرمایا تھا اور جس کا مقطع علمائے دیوبند نے انگریز حاکم کے حضور وفاکیشوں کی عرضداشت کے روپ میں موزوں فرمایا تھا۔ یہ غزل برصغیر ہند میں ان کے اسلاف کی تاریخ کا بیان ہے اور ہم قرآن کی زبان میں ان سے درخواست کرتے ہیں: اقراء کتابک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا۔

ناظرین! مفتی نظر قاسمی صاحب جیسے بزرگ عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں فلاں بزرگ نے انگریزوں کے خلاف یہ کہا اور وہ کیا۔ ہم کہتے ہیں کہ مان لیا چند لوگوں نے کچھ کیا ہوگا لیکن جن لوگوں نے مجاہدین کی مخالفت کی۔ جہاد کی مخالفت کی۔ انگریزوں کو مدد کے طور پر گھوڑے اور سوار مہیا کئے۔ انگریزوں کو چندے دئے۔ مجاہدین کی مخبریاں کیں۔ وہابی مقدمات میں وہابیوں کے خلاف گواہیاں دے کر تحریک مجاہدین کی پشت میں خنجر گھونپے۔ مسلم مفادات سے غداریاں اور انگریز سے وفائیں کیں وہ اگر حنفی نہیں تھے تو بتایا جائے کہ پھر وہ کون تھے؟ وہابی اور اہل حدیث تو آج بھی اقلیت میں ہیں اور ۱۸۵۷ء کے اردگرد تو وہ تھے ہی خال خال۔ برصغیر صدیوں سے حنفیوں ہی کا سمندر بنا ہوا ہے۔ وہ سینکڑوں ہزاروں نواب اور نواب زادے جاگیردار اور خان بہادر جنہوں نے انگریز حکمرانوں کے بوٹ پالش کر کے جائدادیں حاصل کیں وہ احناف کے اسلاف نہیں تھے تو پھر کون تھے؟ ایک سید صدیق حسن آج تک بعض لوگوں کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھ رہا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ انگریزوں کا وفادار اور جہاد کا مخالف تھا اور ثبوت کے طور پر اس کی بعض تحریریں اچھالی جاتی ہیں۔ کاش ان لوگوں نے کبھی یہ بھی سوچا ہوتا کہ اگر سید صدیق حسن واقعی انگریز کا وفادار اور جہاد کا مخالف تھا تو انگریزوں نے اسے نوابی سے معزول کیوں کیا؟ اگر کسی کو وجہ معلوم نہیں ہے تو ہم ایک غیر جانبدار مصنف کی تحریر پڑھائے دیتے ہیں جو یوں ہے:

۱۴ سال کی نوابی کے بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا اور ۱۸۸۵ء میں بعض سیاسی

انتظامی اور شخصی شکایات کی بنا پر جن میں ترغیب جہاد اور مذہب وہابیت کی ترغیب شامل ہے آپ کے خطابات اور اختیارات سلب کر لئے گے۔ اور سردربار یہ حکم سنایا گیا امور ریاست میں آپ کو دخل دینے کی ممانعت کر دی گئی بلکہ ۸ مہینے تک آپ کو رئیسہ عالیہ (اہلیہ محترمہ) سے دور قیام کرنا پڑا۔ اس کے بعد آپ ۵ سال اور زندہ رہے اور آخر دم تک علمی تصانیف میں مشغول رہے۔ وفات ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء کو ہوئی۔ (موج کوثر، شیخ اکر، لاہور ۱۹۹۲ء ص ٦٦)۔ وفاداروں کو معزول نہیں کیا جاتا۔ انہیں تو مزید اعزازات سے نوازا جاتا ہے ترغیب جہاد اگر انگریزوں کے سوا کسی اور کے خلاف تھی تو انگریزوں کو انہیں معزول کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جس شخص کو اتنی بھی سمجھ نہ ہو وہ اگر تاریخ کے اس دور کو اپنی مشق ستم سے معاف رکھے تو اس میں بہتوں کا بھلا ہوگا۔ اور وہابی مولوی محمد حسین مرحوم نے اگر کوئی غلطی کی ہے تو ہم اس کی طرف سے معافی مانگتے ہیں کہ وہ ختم نبوت کے ایک سپاہی کی لغزشوں سے درگزر فرما کر اسے اپنی رحمت کی چادر میں سمیٹ لے۔ آمین۔